رموز بیخودی — علامہ اقبال کے شعری سفر کا برزخی سنگ میل

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

مثنوی رموز بیخودی علامہ اقبال کے فکری ارتقاء اور قومی مقاصد کی برآری کے لیے علامہ اقبال کی جدوجہد کا ایک نمایاں سنگ میل ہے۔ علامہ کی تمام شعری کاوشوں میں رموز بیخودی اس لحاظ سے محوری حیثیت رکھتی ہے کہ یہ مثنوی علامہ کے تمام شعری آثار کا مقام برزخ ہے۔ ۱۹۱۸ء میں جب رموز بیخودی شائع ہوئی تو اس سے پہلے اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں شائع ہو چکی تھی۔ خود علامہ کے بقول اسرار خودی رموز بیخودی کا پس منظر یا ابتدائیہ تھی جبکہ ادھورے مطالب کی تکمیل کے لیے رموز بیخودی تصنیف کی گئی۔ اور پھر رموز بیخودی سے پیدا ہونے والے سوالات کا جواب علامہ نے بعد کی شعری کاوشوں میں دیا۔ رموز بیخودی کے دیباچے سے جو علامہ نے خود لکھا اس مثنوی کی مرکزی اور محوری حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔ اسی دیباچے میں علامہ نے رموز بیخودی کے اسرار خودی سے تعلق کو بیان کرتے ہوئے لکھا:

> یہ مثنوی کسی طویل الذیل دیباچے کی محتاج نہیں تاہم اس کے مقاصد کی ایک مختصر تشریح ضروری ہے جس طرح حیاتِ افراد میں جلب منفعت دفع مضرت تعینِ عمل و ذوق حقائق عالیہ احساس نفس کے تدریجی نشوونما۔ اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے اسی طرح ملل و اقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر ''قومی انا'' کی حفاظت۔ تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر تمام کے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔ افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔[1]

اور پھر رموز بیخودی کو اسرار خودی کا تسلسل قرار دیا:

> گویا قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لیے بمنزلہ قوتِ حافظہ کے ہے جو اُس کے مختلف مراحل کے حسیات و اعمال کو مربوط کر کے ''قومی انا'' کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے۔ علم الحیات و عمرانیات کے اسی نکتے کو مدِ نظر

رکھ کر مَیں نے ملتِ اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مختلف اجزا و عناصر پر نظر ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی حیات کا صحیح ادراک اسی نقطۂ نگاہ سے حاصل ہوسکتا ہے۔[۲]

رموز بیخودی سے مقصود ہی ملت کی تشکیل ہے۔ اس کی زندگی کے مضبوط اور محکم عملی اصولوں کا بیان کہاں ہوگا؟ اس کا جواب اس دیباچے میں علامہ نے یوں دیا:

البتہ اس ضمن میں ایک ضروری سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی مختص للّٰہیت جماعت کا انحطاط زائل کرنے اور اُس کی زندگی مضبوط و محکم کرنے کے عملی اُصول کیا ہیں؟ اس سوال کا مجمل جواب مثنوی کے دونوں حصوں میں آ چکا ہے مگر مفصل جواب کے لیے ناظرین کو انتظار کرنا چاہیے اگر وقت نے مساعدت کی تو اس مثنوی کا تیسرا حصہ اسی سوال کا تفصیلی جواب ہوگا۔[۳]

علامہ نے بعدازاں بھی اپنی اس تصنیف کو اس نکتے یعنی انفرادی خودی اور قومی بے خودی یا اجتماعی انا کی توضیح قرار دیا۔ قاضی نذیر احمد کے نام ۱۲ رمئی ۱۹۳۷ء کے خط میں لکھا:

جنابِ من! ڈاکٹر صاحب کو آپ کا خط مل گیا ہے۔ وہ خود علیل ہیں اس واسطے مجھ سے آپ کے سوالات کا مندرجہ ذیل جواب لکھوایا ہے:

۱- میری تحریروں میں خودی کا لفظ دو معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ اخلاقی اور مابعدالطبیعی ہر دو معنوں میں لفظ مذکور کی تشریح واضح طور پر کر دی گئی ہے جس میں فارسی جاننے والے کو کسی قسم کی شک کی گنجایش نہیں رہتی۔ 'اسرار خودی' اور رموزِ بیخودی دونوں کا موضوع یہی مسئلہ خودی ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ کو اطمینان ہوجائے گا۔ اگر ان دونوں میں یا کسی اور کتاب میں آپ کو کوئی ایسا شعر ملے جس میں خودی کا مفہوم تکبر یا نخوت لیا گیا ہو تو اس سے مجھے آگاہ کیجیے گا۔

اس کے علاوہ مذکورہ بالا دونوں کتابیں انیس سو چودہ اور ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئیں۔ اُس وقت سے لے کر اس وقت تک سینکڑوں مضمون ان کے مطالب کی تشریح میں لکھے گئے ہیں۔ باوجود ان کے اگر کسی کو غلط فہمی ہو تو اس کا کیا علاج ہوسکتا ہے۔ اس زمانے میں یہ ممکن نہیں کہ سچائی کی دو قسمیں قرار دی جائیں ایک عوام کے لیے، ایک خواص کے لیے اور جو صداقت خواص کے لیے ہو، اُسے عوام پر ظاہر نہ کیا جائے۔ لیکن میرے حالات کے لیے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ میں نے مسئلہ خودی کے صرف اس پہلو کو نمایاں کیا ہے جس کا جاننا اس زمانے کے ہندی مسلمانوں کے لیے میرے خیال میں ضروری ہے اور جس کو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔ خودی کے متعلق تصوف کے جو دقیق مسائل ہیں، اُن سے میں نے اعراض کیا ہے۔[۴]

اسرار خودی کے بعد رموز بیخودی کی تصنیف سے علامہ کے پیش نظر کیا مقاصد تھے، اس کا اندازہ ان ناموں سے بھی ہوتا ہے جو مختلف مراحل پر ان کتب کے لیے علامہ کے زیرِغور رہے۔ ابتداً علامہ کے پیش نظر یہ نام 'اسرار حیات'، 'پیام سروش'، 'پیام نو' اور 'آئین نو' تھے۔ ۶ فروری ۱۹۱۵ء کو خواجہ حسن نظامی

کے نام لکھا:

ڈیئر خواجہ صاحب! آپ کی سرکار سے جو خطاب مجھے عطا ہوا ہے، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت واستحکام پر بحث کی ہے، اب قریباً تیار ہے اور پریس جانے جو ہے۔ اس کے لیے کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمایئے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کے نام ''اسرارِ حیات''، ''پیامِ سروش''، ''پیامِ نو''، ''آئینِ نو'' تجویز کیے ہیں۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمایئے اور نتائج سے مجھے مطلع کیجیے تاکہ مَیں انتخاب کرسکوں۔[۵]

جب یہ مثنوی مکمل ہو رہی تھی تو علامہ رموز بیخودی کو 'اسرارِ حیات ملیہ اسلامیہ' سے تعبیر کر رہے تھے۔ ۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء کو سید سلیمان ندوی کے نام علامہ نے لکھا:

مؤلف سے میری مراد ایڈیٹر کتاب الطواسین موسیو مسیگنان ہے جس نے فرانسیسی زبان میں طواسین کے مضامین پر حواشی لکھے ہیں۔ ان شاءاللہ معارف کے لیے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ میری صحت بالعموم اچھی نہیں رہتی، اس واسطے بہت کم لکھتا ہوں۔ مثنوی اسرارِ خودی کا دوسرا حصہ یعنی رموزِ بیخودی (اسرارِ حیاتِ ملیۂ اسلامیہ) قریب الاختتام ہے۔ شائع ہونے پر ارسالِ خدمت کروں گا۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔[۶]

اس طرح علامہ نے ایک خط میں اس مثنوی کو دورِنو کی منطق الطیر سے بھی تعبیر کیا۔ اس کے بعد علامہ نے ہماری علمی وشعری روایت سے اپنی کتاب گلشن راز جدید کو محمود شبستری کی گلشن راز سے معناً اور ہیئت کے لحاظ سے منسوب کیا۔ رموز بیخودی کو منطق الطیر قرار دیتے ہوئے علامہ نے لکھا:

اس مثنوی کا دوسرا حصہ رموز بیخودی زیرِطبع ہے، فروری یا مارچ میں شائع ہوجائے گا۔ تو آپ کے ملاحظہ کے لیے ارسال ہوگا۔ تیسرے حصے کا بھی آغاز ہوگیا ہے۔ یہ ایک نئی قسم کی منطق الطیر ہوگی۔[۷]

اسرار خودی کی تصنیف کے وقت علامہ کے پیشِ نظر حیات فردیہ تھی۔ اقبال کے ایک اور بیان کے مطابق مثنوی اسرار خودی تحریر کرنے کا آغاز تو ۱۹۱۰ء سے ہوگیا تھا، مگر ابتدا میں یہ مثنوی بطور حقایق حیات فردیہ، انہوں نے اردو میں لکھنا شروع کی۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

میں نے ''اسرارخودی'' پہلے اردو میں لکھنی شروع کی تھی مگر مطالب ادا کرنے سے قاصر رہا۔ جو حصہ لکھا گیا تھا، اس کو تلف کر دیا گیا۔ کئی سال بعد پھر یہی کوشش میں نے کی۔ قریباً ڈیڑھ سو اشعار لکھے، مگر میں خود ان سے مطمئن نہیں ہوں۔

یہ مثنوی فارسی میں کیوں تحریر کی گئی؟ اس سلسلے میں اقبال خود بیان کرتے ہیں:

۱۹۰۵ء میں جب میں انگلستان آیا تھا تو میں محسوس کر چکا تھا کہ مشرقی ادبیات اپنی ظاہری دلفریبیوں اور

دلکشیوں کے باوجود اس روح سے خالی ہیں، جو انسان کے لیے امید، ہمت اور جرأت عمل کا پیغام ہوتی ہے، جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہیے۔ یہاں پہنچ کر یورپی ادبیات پر نظر ڈالی تو وہ اگرچہ ہمت افروز نظر آئیں لیکن ان کے مقابلے کے لیے سائنس کھڑی تھی، جو ان کو افسردہ بنا رہی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں جب میں انگلستان سے واپس آیا تو میرے نزدیک یورپی ادبیات کی حیثیت بھی تقریباً وہی تھی، جو مشرقی ادبیات کی تھی۔ ان حالات سے میرے دل میں کشمکش پیدا ہوئی کہ ان ادبیات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنی چاہیے اور ان میں روح پیدا کرنے کے لیے کوئی نیا سرمایۂ حیات فراہم کرنا چاہیے۔ میں اپنے وطن گیا تو یہ کشمکش میرے دل میں جاری تھی اور میں اس درجہ منہمک تھا کہ دو تین سال تک میرے عزیز دوستوں کو بھی علم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ۱۹۱۰ء میں میری اندرونی کشمکش کا ایک حد تک خاتمہ ہوا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہئیں، لیکن اندیشہ تھا کہ ان سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ بہرحال میں نے ۱۹۱۰ء میں اپنے خیالات کو مدِّ نظر رکھ کر اپنی مثنوی ''اسرارِ خودی'' لکھنی شروع کی اردو کو چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنے شروع کرنے کے متعلق اب تک مختلف لوگوں نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے، آج میں یہ راز بھی بتا دوں کہ میں نے فارسی میں شعر کیوں کہنے شروع کیے۔ بعض اصحاب خیال کرتے ہیں کہ فارسی زبان میں نے اس لیے اختیار کی کہ میرے خیالات زیادہ وسیع حلقے میں پہنچ جائیں۔ حالانکہ میرا مقصد اس کے بالکل برعکس تھا۔ میں نے اپنی مثنوی ''اسرارِ خودی'' ابتداء میں صرف ہندوستان کے لیے لکھی تھی اور ہندوستان میں فارسی سمجھنے والے بہت کم تھے۔ میری غرض یہ تھی کہ جو خیالات میں باہر پہنچانا چاہتا ہوں وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں۔ اس وقت مجھے یہ خیال تک بھی نہ تھا کہ یہ مثنوی ہندوستان کی سرحدوں سے باہر جائے گی یا سمندر کا سینہ چیر کر یورپ پہنچ جائے گی۔ بلا شبہ یہ صحیح ہے کہ اس کے بعد فارسی کی دلکشی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں اسی زبان میں شعر کہتا رہا۔

اقبال کے فکر کا محور انفرادی اور اجتماعی خودی رہی۔ حتی کہ اس حوالے سے ان کے نظریات کی حتمی شکل وہی رہی جو ان کی مثنویوں ،اسرارخودی اور رموز بیخودی میں ملتی ہے۔ مثنوی اسرارخودی میں پیش کردہ نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے مہاراجہ کشن پرشاد کو تحریر کیا:

> میں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی گذشتہ دماغی تاریخ اور موجودہ حالت پر بہت غور کیا ہے، جس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ان دونوں قوموں کے اطباء کو اپنے مریض کا اصل مرض اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ان کا اصل مرض قوائے حیات کی ناتوانی اور ضعف ہے اور یہ ضعف زیادہ تر ایک خاص قسم کے لٹریچر کا نتیجہ ہے جو ایشیا کی قوموں کی بدنصیبی سے ان میں پیدا ہو گیا.....اب حالات حاضرہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ اس نقطۂ خیال کی اصلاح کی جائے۔

اسرار کی تصنیف پر علامہ نے ڈاکٹر نکلسن کے نام ۲۶ جنوری ۱۹۲۱ء کے خط میں اس نکتے کی بھی وضاحت کر دی کہ اسرار کا فلسفہ مسلمان صوفیاء اور اہل حکمت سے ماخوذ ہے:

میں اس بارے میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اسرارِ خودی پر چند تشریحی نوٹ لکھے تھے جنھیں آپ نے دیباچہ اسرار میں شامل کر لیا ہے۔ ان تفسیری حواشی میں مَیں نے مغربی مفکرین کے افکار و عقائد کی روشنی میں اپنی حیثیت واضح کی ہے۔ یہ طریق محض اس لیے اختیار کیا گیا تھا تا کہ انگلستان کے لوگ میرے خیالات بہ آسانی سمجھ لیں۔ ورنہ قرآن حکیم، صوفیائے کرام اور مسلمان فلسفیوں کے افکار سے بھی استدلال کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسرار کے پہلے ایڈیشن میں بزبانِ اُردو جو دیباچہ لکھا ہے اس میں یہی طریقِ استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ اسرار کا فلسفہ مسلمان صوفیا اور حکما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے اور تو اور وقت کے متعلق برگسان کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کے لیے نئی چیز نہیں۔ قرآن الٰہیات کی کتاب نہیں بلکہ اس میں انسان کی معاش و معاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے پوری قطعیت سے کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا تعلق الٰہیات ہی کے مسائل سے ہے۔ عہدِ جدید کا ایک مسلمان اہلِ علم جب ان مسائل کو مذہبی واردات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے جن کا مبدا اور سرچشمہ قرآنِ مجید ہے، تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے اہلِ مغرب اسلامی فکریات کی تاریخ سے ناآشنائے محض ہیں۔ اے کاش مجھے اس قدر فرصت ہوتی کہ میں اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر مغربی فلسفیوں کو اس حقیقت سے روشناس کر دیتا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے فلسفیانہ خیالات ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ ہیں۔

کیا اسرار خودی کی تصنیف کا محرک روحانی یا وجدانی تھا؟ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اپنے ایک خط محررہ ۱۴ اپریل ۱۹۱۶ء میں لکھتے ہیں:

یہ مثنوی جس کا نام اسرار خودی ہے، ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی و بے خودی کی طرف ہے۔ مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی، جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے، میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لیے کیوں انتخاب کیا گیا۔ جب تک اس کا دوسرا حصہ ختم نہ ہو لے گا، میری روح کو چین نہ آئے گا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ بس میرا یہی ایک فرض ہے اور شاید میری زندگی کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہوگی، کیونکہ ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار میں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر و اجزا و اسباب کو اپنے شکار (خواہ وہ شکار کوئی قوم ہو خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدنصیب

شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربی تصور کرتا ہے مگر:

من نوائے شاعرِ فرداستم

اور:

نا امید ستم ز یارانِ قدیم
طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

نہ خواجہ حسن نظامی رہے گا نہ اقبال۔ یہ بیج جو مردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے، اُگے گا، ضرور اُگے گا اور علی الرغم مخالفت بارآور ہوگا۔ مجھ سے اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ الحمدللہ۔

شیخ اعجاز احمد کے خیال میں اقبال کے اس کشف کا تعلق ۱۹۱۰ء سے ہے۔ انارکلی والے مکان میں وہ رات گئے اشعار قلم بند کرنے کی غرض سے نچلی منزل میں واقعہ اپنے دفتر میں گئے۔ جب واپس اوپر جانے لگے تو کمرے میں ایک دراز قد، سفید ریش، متبرک صورت بزرگ جو سفید لباس پہنے ہوئے تھے، دکھائی دیئے۔ بزرگ نے انہیں ارشاد کیا کہ پانچ سو آدمی تیار کرو اور اتنا کہنے کے بعد غائب ہو گئے۔ چند ماہ بعد جب اقبال موسم گرما کی تعطیلات میں سیالکوٹ آئے تو اس واقعہ کا ذکر اپنے والد سے کیا۔ میاں جی نے انہیں کہا کہ میں سمجھتا ہوں تمہیں ہدایت ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو صحیح معنوں میں زندہ کرنے اور انہیں ''آدمی'' بنانے والی پانچ سو اشعار کی کتاب لکھو۔ شیخ اعجاز احمد کی رائے میں اس کشفی ہدایت کی تعمیل میں لکھی جانے والی کتاب دراصل مثنوی اسرار خودی تھی۔ ایک خواب تھا جس میں مولانا رومی نے اقبال کو مثنوی لکھنے کی تلقین کی تھی:

روئے خود بنمود پیر حق سرشت
کو بحرف پہلوی قرآں نوشت
گفت اے دیوانہ ارباب عشق
جرعہ گیر از شراب ناب عشق[۵]

علامہ نے اسرار خودی اور رموز بیخودی کے مضامین کو باہم منطقی ربط سے ترتیب دیا یعنی خودی سے بےخودی کی طرف کس طرح آئیں گے اور خودی کے مقابل بےخودی کا مفہوم کیا ہوگا۔ اس تصور کو بھی واضح کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی کے نام ۲۰ر جولائی ۱۹۲۸ء کو لکھتے ہیں:

یہ بات دُرست نہیں بلکہ میری بدنصیبی یہ ہے کہ آپ نے مثنوی اسرار خودی کو اب تک نہیں پڑھا۔ میں نے کسی گذشتہ خط میں عرض بھی کیا تھا کہ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محترز رہنے کے لیے میری خاطر سے ایک دفعہ پڑھ لیجیے۔ اگر آپ ایسا کرتے تو یہ اعتراض نہ ہوتا۔

آں چناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو

اور اسرارِ خودی میں کوئی تناقض نہیں۔ یہ بات تو میں نے پہلے حصہ میں اس سے بھی زیادہ واضح طور پر بیان کی ہے:

اندکے اندر حرائے دل نشیں
ترکِ خود کن سوئے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو سوئے خود گام زن
لات و عزائے ہوس را سرشکن
ہرکہ در اقلیم لا آباد شد
فارغ از بندِ زن و اولاد شُد

میں اس خودی کا حامی ہوں جو سچی بے خودی سے پیدا ہوتی ہے، یعنی جو نتیجہ ہے ہجرت الی الحق کرنے کا، اور جو باطل کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح مضبوط ہے۔

بندۂ حق پیش مولا لاستے
پیشِ باطل از نعم برجاستے

دوسرے حصے میں عالمگیر کی ایک حکایت ہے۔ اس میں یہ شعر ہے: ؎

یں چنیں دل خود نما و خود شکن
دارد اندر سینۂ مومن وطن

مگر ایک اور بے خودی ہے جس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک وہ جو Lyric Poetry کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس قسم سے ہے جو افیون و شراب کا نتیجہ ہے۔

(۲) دوسری وہ بے خودی ہے جو بعض صوفیہ اسلامیہ اور تمام ہندو جوگیوں کے نزدیک ذاتِ انسانی کو ذاتِ باری میں فنا کر دینے سے پیدا ہوتی ہے، اور یہ فنا ذاتِ باری میں ہے، نہ احکامِ باری تعالیٰ میں۔

پہلی قسم کی بے خودی تو ایک حد تک مفید بھی ہو سکتی ہے مگر دوسری قسم تمام مذہب و اخلاق کے خلاف جڑ کاٹنے والی ہے۔ میں ان دو قسموں کی بے خودی پر معترض ہوں اور بس حقیقی اسلامی بے خودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات، رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے۔ اس طرح پر کہ اس پابندی کے نتائج سے انسان بالکل لاپروا ہو جائے اور محض رضا و تسلیم کو اپنا شعار بنائے۔ یہی اسلامی تصوف کے نزدیک 'فنا' ہے؛ البتہ عجمی تصوف فنا کے کچھ اور معنی جانتا ہے جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے، اُن کے مقاصد کچھ اور تھے۔ آیاتِ قرآنی جو آپ نے لکھی ہیں، زیرِ نظر ہیں۔ میں ان کے وہی معانی سمجھتا ہوں جو آپ کے ذہن میں ہیں۔ حیاتِ دُنیا بیشک لہو و لعب ہے۔ میں

نے بھی پہلے حصہ میں (اسرارِ خودی) یہی لکھا ہے:

درقبائے خسروی درویش زی
دیدہ بیدار خدا اندیش زی

پھر دوسرے حصے میں ہے جس میں حضرت عمرؓ کا ایک قول منظوم کیا ہے:

راہ دشوار اس ساماں کم بگیر
درجہاں آزاد زی، آزاد میر
سجۂ اَقللن من الدنیا شمار
از تعشِ حراً شوی سرمایہ دار

غرض یہ کہ سلطنت ہو، امارت ہو، کچھ ہو، بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ یہ ذرائع ہیں اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کے جو شخص ان کو بجائے خود مقصد جانتا ہے، وہ رضوا بالحیوٰۃِ الدنیا میں داخل ہے۔ کوئی فعل مسلمان کا ایسا نہ ہونا چاہیے جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے سوا کچھ اور ہو۔ مسلمان کی تعریف پہلے حصے میں یوں کی گئی ہے (اسرار خودی): ؎

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ
عشق رانا موس و نام ونگ دہ
طبع مسلم از محبت قاھراست
مسلم اور عاشق عبشد کا فراست
تابع حق دیدنش، نادیدنش
خوردنش، نوشیدنش، خوابیدنش
دررضایش مرضیِ حق گم شود
ایں سخن کے بادرِ مردم شود

زیادہ کیا عرض کروں، سوائے اس کے کہ مجھ پر عنایت فرمایئے۔ عنایت کیا رحم کیجیے اور اسرارِ خودی کو ایک دفعہ پڑھ جایئے۔ جس طرح منصور کو شبلی کے پتھر سے زخم آیا اور اُس کی تکلیف سے اُس نے آہ وفریاد کی، اسی طرح مجھ کو آپ کا اعتراض تکلیف دیتا ہے۔

رموز بیخودی کی تصنیف کے مقاصد کی وضاحت کے سلسلے میں سر عبدالقادر مثنوی کے اس حصے کی وجہِ تصنیف علامہ اقبال ہی کی زبانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب کہنے لگے، میں عبدالرحمٰن بجنوری کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا بڑا معترف ہوں بلکہ ایک اعتبار

سے ممنون بھی ہوں۔ وہ یوں کہ جب اسرار خودی شائع ہوئی تو بجنوری نے ایک تنقیدی مضمون لکھا، جس میں خودی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد یہ کہا کہ اقبال فرد کی خودی پر اتنا زور دے رہا ہے کہ اس سے یہ خوف پیدا ہو چلا ہے کہ شاید اس کے پیش نظر ملت کا وجود نہیں۔ حالانکہ انفرادی خودی کی تکمیل بھی ملت ہی میں گم ہو کر ہوتی ہے۔ بجنوری کے اس مضمون کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ رموز بیخودی لکھ کر اس قسم کے اندیشوں کا ازالہ کردوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر بجنوری کا مضمون نہ چھپتا تو رموز بیخودی لکھی جاتی یا نہ لکھی جاتی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ بجنوری کا مضمون پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ رموز بیخودی کا لکھا جانا بے حد ضروری ہے۔

اسی طرح نیاز الدین خان کے نام ایک خط محررہ ۲۷ جون ۱۹۱۷ء میں ''رموزِ بیخودی'' کے موضوع پر اقبال نے تحریر کیا:

جہاں تک مجھے معلوم ہے، ملّتِ اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ نئے اسکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیّت پر ناز کرتا ہے، وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیّت کے اصول حقّہ صرف اسلام نے ہی بتائے ہیں جن کی پختگی اور پائیداری مرورایّام واعصار سے متاثر نہیں ہو سکتی۔

رموز بیخودی کے مضامین کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱-تعارف

(i) مولانا روم سے انتساب

جہد کن در بے خودی خود را بیاب
زودتر، واللہ اعلم بالصواب[9]

(ii) پیش کش بحضور ملت اسلامیہ

(iii) تمہید۔ در معنی ربط فرد و ملت

(iv) در معنی ایں کہ ملت از اختلاطِ افراد پیدا می شعر و تکمیل تر بیت او از نبوت است

۲-ارکان اساسی ملت اسلامیہ

رکن اول۔ توحید

(i) در معنی ایں کہ یاس وحزن وخوف ام الخبائث است و قاطع حیات و توحید ازالہ این امراض خبیثہ می کند۔

(ii) حکایات۔ ا۔ محاورہ تیر وشمشیر

ب۔ حکایت شیر وشہنشاہ عالمگیر

رکن دوم ۔ رسالت

(i) درمعنی ایں کہ مقصود رسالت محمدیہ تشکیل تاسیس حریت ومساوات واخوت بنی نوع آدم است

حکایات

(i) حکایت بوعبیدہ وجابان درمعنی اخوت اسلامیہ

(ii) حکایت سلطان مراد ومعمار درمعنی مساوات اسلامیہ

(iii) درمعنی حریت اسلامیہ وسرحادثہ کربلا

۳۔ خصائص ملت اسلامیہ

(i) زمانی ۔ مکانی بقا

ا۔ درمعنی ایں کہ چوں ملت محمدیہ موسس برتوحید ورسالت است پس نہایت مکانی ندارد

ب۔ درمعنی ایں کہ وطن اساس ملت نیست

ج۔ درمعنی ایں کہ ملت محمدیہ نہایت زمان ہم ندارد کہ دوام ایں ملت شریفہ موعود است

(ii) آئین ملت

ا۔ درمعنی ایں کہ نظام ملت غیر از آئین صورت نہ بندد وآئین ملت محمدیہ قرآن است

ب۔ درمعنی ایں کہ درزمانہ انحطاط تقلید از اجتہاد اولی تر است

ج۔ درمعنی ایں کہ پختگی سیرت ملیہ از اتباع آئین الٰہیہ است

(iii) سیرت ملت

درمعنی ایں کہ حسن سیرت ملیہ از تادب بآداب محمدیہ است

(iv) مرکز ملت

درمعنی ایں کہ حیات ملیہ مرکز محسوس میخواہد مرکز ملت اسلامیہ بیت الحرم است

(v) ملی نصب العین

درمعنی ایں کہ جمعیت حقیقی از محکم گرفتن نصب العین ملیہ است ونصب العین امت محمدیہ حفظ ونشر توحید است

(vi) توسیع حیات ملیہ

درمعنی ایں کہ توسیع حیات ملیہ از تسخیر قوائے نظام عالم است

(vii) کمال حیات ملیہ

در معنی ایں کہ کمال حیات ملیہ ایں است کہ ملت مثل فرد احساس خودی پیدا کند و تولید و تکمیل ایں احساس از ضبط روایات ملیہ ممکن گردد۔

(viii) بقائے ملت

ا۔ در معنی ایں کہ بقائے نوع از امومت است و حفظ و احترام امومت اسلام است

ب۔ در معنی ایں کہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا اسوہ کاملہ ایست برائے نساء السلام

ج۔ خطاب بہ مخدرات اسلام

۴۔ خلاصہ مطالب مثنوی در تفسیر سورۃ اخلاص

۵۔ عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعلمین۔

کتاب کا آغاز مولانا روم کے اس شعر سے کیا گیا ہے:

جہد کن در بے خودی خود را بیاب
زودتر، واللہ اعلم بالصواب

یہ شعر ایک لحاظ سے کتاب کا مولانا روم سے انتساب بھی ہے اور علامہ کے منشا و مقصود کا بیان بھی۔ یعنی اس مثنوی کے لیے علامہ نے بے خودی کا لفظ مثنوی سے کیا۔ مثنوی بے خودی میں لفظ بے خودی کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثنوی کے دفتر دوم[۱۰] دفتر سوم[۱۱]، دفتر چہارم[۱۲] اور دفتر پنجم[۱۳] میں یہ لفظ مولانا لاتے ہیں۔ مگر ان تمام اشعار سے رموز بیخودی کے لیے علامہ نے جس شعر کا انتخاب کیا وہ اپنے نفس مضمون اور الفاظ یعنی جہد، بے خودی، خود را یافتن، اور زودتر کے لحاظ سے علامہ کے پیغام سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہ شعر جس پس منظر میں مثنوی معنوی میں آیا ہے وہ علامہ کے تصور خودی اور بے خودی کے باہمی ربط کی وضاحت بھی ہے۔ یہ شعر دفتر چہارم کی ایک حکایت سے ہے جس کا عنوان ہے:

در بیان آنکہ شہزادہ، آدمی بچہ است و خلیفہ خداست پدرش، آدم صفی خلیفہ حق سجود ملایك، و آن کمپیر کابلی دنیاست کہ آدمی بچہ را از پدر ببرید بہ سحر، و انبیا و اولیا آن طبیب تدارك کننده اند۔[۱۴]

مثنوی کو اس حکایت کے مطابق جب ایک بادشاہ کا شہزادہ جادو کے اثرات کے تحت اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے تو بادشاہ کے لیے یہ واقعہ ایک سانحہ جانکاہ ثابت ہوتا ہے۔ بصد تدبیر جب وہ شہزادہ صحت یاب ہوتا ہے تو مولانا بادشاہ کی اس ساری پریشانی اور مصیبت کے ازالے کو بندہ مومن کے احوال سے مناسبت دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بندہ مومن کی چشم بصیرت دنیا کی افسوں گری سے نابینا ہو چکی ہے۔ اس کی صحت یابی اس میں ہے کہ وہ ذات حق کے سامنے بیخود ہو جائے تا کہ وہ واصل بحق ہو سکے۔ یہی مفہوم

علامہ کے رموزِ بیخودی کو منطق الطیر قرار دینے میں ہے۔[۱۵] منطق الطیر کا یہ شعر اس مفہوم کو بیان کرتا ہے جو خودی کے انتساب کے طور پر دیئے گئے مولانا کے شعر میں ہے:

تو درو گم شو وصال ایں است وبس
تو ممان اصلا کمال ایں است و بس

اس بےخودی کی وضاحت مثنوی کے دوسرے اشعار سے یوں ہوتی ہے:

عقل سایہ حق بود حق آفتاب
سایہ را با آفتاب او چہ تاب
چوں پری غالب شود بر آدمی
گم شود از مرد وصف مردمی
ہر چہ گوید آن پری گفتہ بود
زیں سرے نہ، زآں سرے گفتہ بود
پس خداوند پری و آدمی
از پری کے باشدش آخرکمی
گرچہ قرآن از لب پیغمبر است
ہر کہ گویہ حق نگفت او کافر است[۱۶]

رموز بیخودی کی تصنیف کے بعد اس مثنوی کا تیسرا حصہ ''حیات مستقبلہ ملت اسلامیہ'' علامہ کے پیش نظر تھا۔ ۱۹۱۷ء کے اواخر میں رموز بیخودی مکمل ہوئی، اس دوران اقبال مثنوی کے تیسرے حصے بعنوان ''حیاتِ مستقبلہ اسلامیہ'' تحریر کرنے پر بھی غور کر رہے تھے۔ چنانچہ گرامی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

مگر اب تیسرا حصہ ذہن میں آ رہا ہے اور مضامین دریا کی طرح امڈے آ رہے ہیں اور حیران ہو رہا ہوں کہ کس کس کو نوٹ کروں۔ اس حصے کا مضمون ہوگا، حیات مستقبلۂ اسلامیہ یعنی قرآنِ شریف سے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے اور جماعتِ اسلامیہ، جس کی تاسیس دعوتِ ابراہیمی سے شروع ہوئی، کیا کیا واقعات وحوادث آیندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے اور بالآخر ان سب واقعات کا مقصود و غایت کیا ہے۔ میری سمجھ اور علم میں یہ تمام باتیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں اور استدلال ایسا صاف اور واضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہے کہ اس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم مجھ کو عطا کیا ہے۔ میں نے پندرہ سال تک قرآن پڑھا ہے اور بعض آیات اور سورتوں پر مہینوں بلکہ برسوں غور کیا ہے اور اتنے طویل عرصے کے بعد مندرجہ بالا نتیجہ پر پہنچا ہوں، مگر مضمون بڑا نازک ہے اور اس

کا لکھنا آسان نہیں ۔ بہرحال میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کو ایک دفعہ لکھ ڈالوں گا ، اور اس کی اشاعت میری زندگی کے بعد ہو جائے گی یا جب اس کا وقت آئے گا اشاعت ہو جائے گی ۔

اسی طرح اس ارادے کا اظہار رموز بیخودی کی اشاعت کے بعد ، اکبرالہ آبادی سے بھی اپنے ایک خط محررہ ۲۸ نومبر ۱۹۱۸ء میں کیا اور تیسرے حصے کے چند شعر بھی انہیں لکھے ۔

گو رموز بیخودی کا تیسرا حصہ 'حیات مستقبلہ ملت اسلامیہ' کے عنوان کے تحت تو نہ لکھا جا سکا مگر بعد کی تصانیف خصوصاً جاوید نامہ میں علامہ نے ان تمام مضامین کو بیان کر دیا۔ جاوید نامہ میں 'محکمات عالم قرآنی'[۱۷] کے تحت بیان کیے گئے نکات اس مضمون کو بیان کرتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کے مستقبل کی محکم اساس کیا ہو سکتی ہے۔ محکماتِ عالم قرآنی کے تحت درج ذیل نکات کو علامہ نے بیان کیا ہے:

۱- خلافت آدم

۲- حکومت الٰہی

۳- ارض ملک خداست

۴- حکمت خیر کثیر است

اگر ان نکات کی تفصیلات کو رموز بیخودی کے مضامین کے تناظر میں دیکھا جائے تو بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ محکمات عالم قرآنی نہ صرف رموز بیخودی کے مضامین کی تفصیل و توضیح ہیں بلکہ ان تصورات کے عملی نفاذ و اطلاق کا منہج بھی ہیں۔ اب ان نکات کی وضاحت کی جاتی ہے۔

۱- خلافتِ آدم

در دو عالم ہر کجا آثارِ عشق
ابنِ آدم سرّے از اسرارِ عشق

دونوں جہانوں میں ہر جگہ عشق ہی کے آثار ہیں ۔ آدم کا بیٹا عشق اسرار میں سے ایک راز ہے۔

سرِّ عشق از عالمِ ارحام نیست
او ز سام و حام و روم و شام نیست

سرِ عشق کا تعلق ماؤں کے رحم سے نہیں نہ اس کی نسبت خاندان یا ملک سے ہے۔

کوکبِ بے شرق و غرب و بے غروب
در مدارش نے شمال و نے جنوب

وہ ایسا ستارہ ہے جس کا تعلق نہ مشرق سے نہ مغرب سے اور نہ وہ کبھی غروب ہوتا ہے اور نہ اس کے مدار میں

شمال وجنوب ہے۔

حرفِ اِنی جَاعِل تقدیرِ او
از زمیں تا آسماں تفسیرِ او

اللہ تعالی کا ارشاد کہ ''میں آدم کو زمین میں اپنا نائب بناتا ہوں'' انسان کی تقدیر ہے اور زمین سے آسمان تک ہر شے کی تسخیر اس تقدیر کی تفسیر ہے۔

او امام و او صلوات و او حرم
او مداد و او کتاب و او قلم!

وہ امام ہے وہی صلوۃ اور وہی حرم۔ وہی سیاہی ہے وہی لوح محفوظ اور وہی قلم۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

آدم کا مقام آسمان سے بھی بلند تر ہے احترام آدم ہی تہذیب کی بنیاد ہے۔

زندگی اے زندہ دل دانی کہ چیست؟
عشقِ یک بیں در تماشاے دوئی است!

اے زندہ دل کیا تو جانتا ہے کہ زندگی کیا ہے؟ عشق یک بین کثرت میں وحدت کا تماشا کرتا ہے۔

زن نگہ دارندۂ نارِ حیات
فطرتِ او لوحِ اسرار حیات

عورت نارِ حیات کی محافظہ ہے اس کی فطرت ایسی لوح ہے جس پر اسرار حیات رقم ہوتے ہیں۔

آتشِ ما را بجانِ خود زند
جوہرِ او خاک را آدم کند

وہ ہماری آتش (شوق) کو اپنی جان میں سموتی ہے چنانچہ اس کا جوہر خاک کو آدم بنا دیتا ہے۔

در ضمیرش ممکناتِ زندگی
از تب و تابش ثباتِ زندگی

اس کے ضمیر کے اندر زندگی کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ اس کی تب وتاب سے زندگی ثبات پاتی ہے۔

اے ز دینت عصرِ حاضر بردہ تاب
فاش گویم با تو اسرارِ حجاب

دورِ نو نے تیرے دین کی آب وتاب زائل کر دی ہے۔ میں تجھ پر پردے کے اسرار واضح کرتا ہوں۔

ذوقِ تخلیق آتشے اندر بدن
از فروغِ او فروغِ انجمن!

ذوقِ تخلیق بدن کے اندر آگ کی مانند ہے اسی کی روشنی سے انجمن روشن ہے۔

ہر کہ بردارد ازیں آتش نصیب
سوز و ساز خویش را گردد رقیب

جو بھی اس آگ سے کوئی حصہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے ساز وساز کو محفوظ کر لیتا ہے۔

ہر زماں بر نقشِ خود بندد نظر
تا نگیرد لوحِ او نقشِ دگر

وہ ہر لمحہ اپنے نقش پر نگاہ مرکوز رکھتا ہے مبادا اس کی لوح کسی اور کا نقش اختیار کر لے۔

مصطفیٰؐ اندر حرا خلوت گزید
مدّتے جز خویشتن کس را ندید

جناب رسول پاک نے غار حرا میں خلوت اختیار فرمائی اور مدت تک اپنے سوا کسی اور کو نہ دیکھا۔

نقشِ ما را در دلِ او ریختند
ملّتے از خلوتش انگیختند

آپؐ کے قلب مبارک میں ہمارا نقش ڈالا گیا۔ آپؐ کی خلوت کے اندر سے ایک نئی ملت ابھری۔

می توانی منکرِ یزداں شدن
منکر از شانِ نبیؐ نتواں شدن

اللہ تعالی سے انکار کیا جا سکتا ہے مگر حضورؐ کی عظمتِ شان سے انکار ممکن نہیں۔

از کم آمیزی تخیل زندہ تر
زندہ تر، جوینده تر، یابنده تر!

کم آمیزی سے قلب کے اندر زندگی جستجو اور یافت بڑھتی ہے۔

علم و ہم شوق از مقاماتِ حیات
ہر دو می گیرد نصیب از واردات!

علم اور شوق (عشق) دونوں زندگی کے مقامات میں سے ہیں ہر دو کا تعلق مشاہدات اور تجربات سے ہے۔

ہر کجا بے پردہ آثارِ حیات
چشمہ زارش در ضمیرِ کائنات

جہاں کہیں آثار حیات بے پردہ نظر آئے ہیں۔ان کا سرچشمہ ضمیر کائنات کے اندر ہے۔

در نگر ہنگامہ آفاق را
زحمتِ جلوت مدہ خلّاق را

پس تو ہنگامۂ آفاق دیکھ اس کے خلاق کو جلوت کی زحمت نہ دے۔

حفظِ ہر نقش آفریں از خلوت است
خاتمِ او را نگیں از خلوت است

ہر نقش آفریں کی حفاظت خلوت سے ہے خلوت ہی اس کی انگوٹھی کا نگینہ ہے۔

خلافت آدم کے تحت علامہ نے آدم کے مقام، منصب، تہذیب انسانی کے فروغ وارتقاء عورت کے منصب، تحفظ ناموس اور پردے کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ معاشرے کی تعمیر میں عورت کا وہی کردار جس کا ذکر 'خطاب بہ مخدرات اسلام' میں تھا۔ یہاں زیادہ تفصیل سے آیا ہے۔ علامہ نے معاشرے کی مستحکم اساس اس امر کو قرار کو دیا ہے کہ تخلیق خلوت میں ہوتی ہے اور جلوت میں تخلیقی فعلیت کمزور ہو جاتی ہے لہٰذا اگر معاشرے کو مضبوط اساس پر استوار کرنا ہو تو عورت کے ناموس، تقدس اور امومت کے کردار کا احترام بحال کرنا ہوگا۔

۲-حکومتِ الٰہی

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام او را نہ او کس را غلام

بندۂ حق ہر مقام سے بے نیاز ہے نہ وہ کسی کا غلام ہے نہ کوئی اس کا غلام۔

بندۂ حق مردِ آزاد است و بس
ملک و آئینش خداداد است و بس

بندۂ حق بس مردِ آزاد ہے۔ اس کی حکومت اور آئین اللہ تعالی کا عطا کردہ ہے۔

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف
وصل و فصلش لَا یَرَاعِی لَا یَخَاف

احکام وحی صلح و جنگ دونوں میں عدل پر مبنی ہیں وہ دوستی و دشمنی دونوں میں نہ کسی کی رعایت کرتے ہیں نہ کسی کا خوف رکھتے ہیں۔

غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود

زور وَر بر ناتواں قاہر شود

جب اللہ تعالی کے علاوہ کوئی اور کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔تو اس سے طاقتور کمزور پر مسلط ہو جاتا ہے۔

قاہرِ آمر کہ باشد پختہ کار
از قوانیں گردِ خود بندد حصار

پختہ کار زبردست آمر۔قوانین کے ذریعے اپنے اردگرد قلعہ بنالیتا ہے۔

قاہری را شرع و دستورے دہد
بے بصیرت سُرمہ با کورے دہد!

جبر وتسلط کو قانون اور آئین کی صورت دیتا ہے گویا اندھا اندھے کو سرمہ عطا کرتا ہے۔

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک!
دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک!

پادشاہوں کے آئین ودستور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جاگیردار موٹے ہو جاتے ہیں اور دہقان تکلے کی مانند نحیف ونزار۔

وائے بر دستورِ جمہور فرنگ
مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ!

فرنگی جمہوریت کے دستور پر افسوس فرنگ کی بانگ صور سے مردہ زندہ ہونے کی بجائے اور زیادہ مردہ ہو جاتا ہے۔

دیدہ ہا بے نم ز حُبّ سیم و زر
مادراں را بارِ دوش آمد پسر

سونے چاندی کی محبت نے ان کی آنکھوں سے ہمدردی چھین لی ہے یہاں تک کہ مائیں اپنے بیٹوں کو بوجھ سمجھنے لگی ہیں (مامتا جیسی قیمتی چیز بھی ختم ہوگئی ہے۔)

گرچہ دارد شیوہ ہای رنگ رنگ
من بجز عبرت نگیرم از فرنگ!

اگرچہ افرنگ رنگا رنگ انداز رکھتا ہے مگر میں انہیں دیکھ کر صرف عبرت حاصل کرتا ہوں۔

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو
دامنِ قرآں بگیر آزاد شو!

اے وہ شخص جوان کی تقلید کا غلام بنا ہوا ہے آزاد ہو۔قرآن پاک کا دامن تھام اور صحیح معنوں میں مردِ حر بن

جا۔

حکومتِ الٰہی سے علامہ کی مراد وہ روحانی جمہوریت ہے جس کا اجمالی ذکر تو رموز بیخودی میں آیا اور پھر اسے علامہ نے تشکیل جدید میں بھی بیان کیا۔ یہاں اس کی مزید تفصیلات آئی ہیں ۔مسلم معاشرہ قانون الٰہی اور وحی کا پابند ہوتا ہے۔ دنیاوی جمہوریت کے وہ مفاسد جنہوں نے دنیا کو مسائل کی آماجگاہ بنا دیا ہے ان میں حب سیم و زر، استحصال اور دوسرے مسائل شامل ہیں۔ ان کا ازالہ صرف آئین الٰہی کی پابندی سے ہی ممکن ہے۔

۳- ارض ملک خداست

سر گذشتِ آدم اندر شرق و غرب
بہرِ خاکے فتنہ ہاے حرب و ضرب!

مشرق ومغرب میں آدم کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ لڑائی جھگڑے کے سارے فتنے زمین کے لیے پیدا ہوئے۔

یک عروس و شوہرِ او ما ہمہ
آں فسونگر بے ہمہ ہم با ہمہ!

یہ ایک دلہن ہے اور ہم سب اس کے شوہر اور یہ ساحرہ ہم سب کے ساتھ بھی ہے اور ہمارے بغیر بھی۔

عشوہ ہائے او ہمہ مکر و فن است
نے ازانِ تو نہ از آنِ من است!

اس کے سارے ناز وادا مکر وفن ہیں۔ نہ یہ تیری ہے اور نہ میری۔

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

اللہ تعالی نے زمین کو صرف ہماری متاع فرمایا ہے۔ اور یہ بے بہا متاع مفت ہے مفت۔

دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

جاگیردار مجھ سے یہ نکتہ سمجھ زمین سے رزق اور قبر حاصل کر، زمین پر قبضہ نہ کر۔

تو عقابی طائفِ افلاک شو
بال و پر بکشا و پاک از خاک شو

تو عقاب ہے افلاک کی سیر کر۔ اپنے بال و پر کھول اور خاک سے آزاد ہو۔

باطنِ الارض للہ ظاہر است

ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

زمین اللہ تعالی کی ہے اس کے معنی ظاہر ہیں جو اس ظاہر نہیں دیکھتا وہ کافر ہے۔

من نگویم در گذر از کاخ و کوے
دولتِ تست ایں جہانِ رنگ و بوے

میں نہیں کہتا کہ مکان و آبادی کو چھوڑ دے یہ جہان رنگ و بو (دنیا) تمہاری دولت ہے۔

دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر
صید چوں شاہیں ز افلاکش بگیر

زمین کی خاک سے دانوں کو موتیوں کی طرح چن لیکن شاہیں کی مانند اس کے افلاک سے شکار کر۔

مُردنِ بے برگ و بے گور و کفن؟
گم شدن در نقرہ و فرزند و زن!

بے سروسامانی کی حالت میں اور بغیر گور و کفن کے مرنا کیا ہے؟ سونے، چاندی اور فرزند و زمن میں خو جانا۔

ہر کہ حرفے لآ اِلٰہ از بر کند
عالمے را گم بخویش اندر کند

جس کسی نے لا الہ از بر کر لیا۔ اس نے گویا سارے جہان کو اپنے اندر سمو لیا۔

فقر جوع و رقص و عریانی کجاست
فقر سلطانی است رہبانی کجاست

بھوکا، ننگا رہنا اور رقص کرنا۔ یہ فقر نہیں فقر سلطانی ہے رہبانی نہیں۔

الارض للہ وہ عنوان ہے جو علامہ کے معاشی افکار کا بیان ہے۔ 'ابلیس کی مجلس شوریٰ'[۱۸] میں علامہ نے مطلق ملکیت کی بجائے امانت کے جس تصور کا ذکر کیا تھا وہ اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ اکتناز اور استحصال وہ معاشی بیماریاں ہیں جو معاشرے کو انسانیت کے اوصاف سے محروم کر دیتی ہیں۔ ایک اسلامی معاشرے میں وسائل معیشت سے استفادے کے امکانات ہر شخص کے لیے برابر کھلے ہوتے ہیں۔

۴۔ حکمت خیر کثیر است

'گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر'

اللہ تعالی نے حکمت کو خیر کثیر فرمایا ہے جہاں کہیں تو اس خیر کو دیکھے اپنا لے۔

علم حرف و صَوت را شہپر دہد
پاکی گوہر بہ نا گوہر دہد

علم مصنف اور خطیب کو شہپر عطا کرتا ہے اس سے معمولی شخصیت کو بھی اندرونی پاکیزگی حاصل ہوجاتی ہے۔

علم را بر اوجِ افلاک است رہ
تا ز چشمِ مہر بر کند نگہ

علم کا راستہ افلاک کی بلندیوں تک پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وہ سورج کی آنکھ سے بھی نگاہ چھین لیتا ہے۔

نسخۂ او نسخۂ تفسیرِ کل
بستۂ تدبیر او تقدیرِ کل

علم ساری موجودات کی تفسیر حاصل کرنے کا نسخہ ہے سب کی تقدیر اسی کی تدبیر کے ساتھ وابستہ ہے۔

چشمِ او بر وارداتِ کائنات
تا بہ بیند محکماتِ کائنات

علم کی نظر کائنات کے بارے تجربات پر ہے۔ تاکہ وہ کائنات کے بنیادی اصول دیکھے۔

دل اگر بندد بہ حق، پیغمبری است
ور ز حق بیگانہ گردد کافری است!

دل کو اگر اللہ تعالی سے لگایا جائے تو یہ پیغمبری ہے اور یہ اگر اللہ تعالی سے بیگانہ رہے تو یہی کافری ہے۔

علم را بے سوزِ دل خوانی شر است
نورِ او تاریکی بحر و بر است!

اگر تو علم کو سوزِ عشق کے بغیر پڑھے تو یہ شر ہے۔ ایسے علم کو نور بحر و بر کی تاریکی ہے۔

بحر و دشت و کوہسار و باغ و راغ
از بمِ طیّارۂ او داغ داغ!

بحر، صحرا، کوہسار، باغ و راغ سب اس کے طیاروں کے بموں سے داغ داغ ہوجاتے ہیں۔

سینۂ افرنگ را نارے ازوست
لذّتِ شبخون و یلغارے ازوست

اسی علم نے فرنگیوں کے سینے میں آگ بھڑکائی ہے اور اسی سے انہیں شبخوں اور یلغار کی لذت حاصل ہوئی ہے۔

قوتش ابلیس را یارے شود

نور نار از صحبت نارے شود

اس علم سے حاصل شدہ قوت ابلیس کی مددگار بنتی ہے اور پھر نار یعنی ابلیس کی صحبت سے اس علم کا نور بھی نار بن جاتا ہے۔

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است!

ابلیس کو مارنا مشکل کام ہے کیونکہ وہ نفس کی گہرائیوں میں گم ہے۔

از جلالِ بے جمالے الاماں
از فراقِ بے وصالے الاماں!

ایسے علم کے جلال بے جمال سے خدا کی پناہ۔اس کے لیے وصال فراق سے خدا کی پناہ۔

علمِ بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں!

بغیر عشق کے علم کا تعلق شیاطین سے ہے اور باعشق علم کا تعلق عارفانِ الٰہی سے ہے۔

بے محبت علم و حکمت مُردۂ
عقل تیرے بر ہدف ناخوردۂ

عشق الٰہی کے بغیر علم وحکمت مردہ ہے اور عقل ایسا تیر ہے جو نشانے سے دور۔

کور را بیننده از دیدار کن
بولہب را حیدرِ کرّار کن!

اندھے (علم) کو دیدارِ الٰہی سے بصیر بنا دے اور اس طرح بولہب کو حیدر کرارؓ میں بدل دے۔

رموز بیخودی میں حیات ملیہ کے تسلسل، مقاصد اور توسیع کے باب 'در معنی ایں کی توسیع حیات ملیہ از تسخیر توائے نظام علم است' کا جو عنوان قائم کیا تھا اس کی توضیح 'حکمت خیر کثیر است' کے تحت موجود ہے۔ علامہ یہاں تسخیر کائنات کے لیے علم وحکمت کی اہمیت کو بیان کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ علم طاغوتی کو علم لاہوتی بنانے پر بھی زور دیتے ہیں۔

رموز بیخودی کے مضامین کا یہ مختصر جائزہ واضح کرتا ہے کہ علامہ کی بعد کی تمام شعری اور نثری تصانیف انہی مضامین کی توضیح وتشریح ہیں۔ اسرار خودی کے بعد رموز بیخودی میں علامہ نے انفرادی اور اجتماعی خودی کی تعمیر کے لیے جو اصول تشکیل دیئے تھے وہ اتنے محکم تھے اور علامہ کو ان کے بارے میں اتنا شرح صدر تھا کہ وہ زندگی بھر انہی اصولوں کی تعبیر وتشریح اور ابلاغ کے لیے کاوشیں کرتے

رہے۔

ملت اسلامیہ کے ارکان اساسی کا ذکر کرتے ہوئے جب رموز میں علامہ نے توحید اور رسالت کا ذکر کیا تو یوں لگتا ہے کہ انہوں نے اسلام کے تصور دین وتصور حیات کے تیسرے اہم رکن ''آخرت'' کا ذکر نہیں کیا۔ مگر رموز کا آخری عنوان ''عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین'' اس سوال کا جواب ہے۔ اس کے درج ذیل اشعار علامہ کے تصور آخرت کو بیان کرتے ہیں:

ازدرت خیزد اگر اجزائے من
وائے امروزم خوشا فرداے من
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش
مرقدے در سایۂ دیوار بخش

یعنی علامہ کے نزدیک مرد مومن کا تصور آخرت، جو توحید اور رسالت کے بعد دین کا تیسرا رکن ہے، جنت، دوزخ کے تصور تک محدود یا اس پر ہی مبنی نہیں بلکہ حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ بے کس پناہ کی حضوری، آپ کی خوشنودی اور ابدی سرخروئی کے حصول سے عبارت ہے، جہاں اقبال کائنات کو مخاطب کرتے ہوئے زبان حال سے کہتے ہیں:

دیدۂ آغازم انجامم نگر!

حوالہ جات و حواشی

۱- علامہ اقبال، دیباچہ رموزِ بیخودی، اشاعت اول، ۱۹۱۸ء۔
۲- ایضاً۔
۳- ایضاً۔
۴- شیخ عطاء اللہ، اقبالنامہ مجموعہ مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۵۳۷-۵۳۸۔
۵- ایضاً۔ ص ۶۱۴-۶۱۵۔
۶- ایضاً۔ ص ۱۱۲-۱۱۳۔
۷- ایضاً۔ ص ۵۰۶-۵۰۷
۸- علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۹۔
۹- مثنوی معنوی، دفتر ۴، بیت: ۳۲۱۸۔
۱۰-

تا نگردد نیکوئی ما بدی
اینکہ گفتم ہم نبد جز بیخودی
(دفتر- دوم، بیت: ۸۴۱)

۱۱-

لاف درویشی زنی و بیخودی
ہای و ہوی عاشقان ایزدی
(دفتر- سوم، بیت: ۶۷۸)

در گلستان عدم، چون بے خودیست
مستی از سغراق لطف ایزدست
(دفتر- سوم، بیت: ۲۹۴۲)

ای بدیدہ در فراقم گرم و سرد
باخود آ از بے خودی و باز گرد
(دفتر- سوم، بیت: ۴۶۶۷)

۱۲-

چون همای بیخودی پرواز کرد
آن سخن را بایزید آغاز کرد
(دفتر- چہارم، بیت:۲۱۲۳)

با خودی، با بے خودی دو چار زد
با خود اندر دیدهٔ خود خار زد
(دفتر- چہارم، بیت:۲۱۳۷)

نه همه جا بیخودی شر میکند
بی ادب را، بی ادب تر میکند
(دفتر- چہارم، بیت:۲۱۵۶)

جهد کن در بیخودی، خود را بیاب
زودتر، والله اعلم بالصواب
(دفتر- چہارم، بیت:۳۲۱۸)

۱۳-

بیخودی، بی ابری است، ای نیک خواه
باشی اندر بے خودی چون قرص ماه
(دفتر-پنجم، بیت:۶۸۴)

بے خودی نامد به خود، توش خوانده ای
اختیار از خود نشد، توش رانده ای
(دفتر- چہارم، بیت:۴۱۰۷)

۱۴- مثنوی معنوی، دفتر چہارم
۱۵- شیخ عطاءاللہ، مجموعه مکاتیب اقبال، ص۵۰۶-۵۰۷
۱۶- مثنوی معنوی، دفتر چہارم
۱۷- علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی، ص۶۸۔
۱۸- علامہ اقبال، کلیات اقبال اردو، ص۱۰۷۔